کچھ دُور جاکر اس نے سوچا ایک بار پھر رتن کے پاس چلوں۔ وہ جب اس کے بنگلے پر پہنچا تو وہ اپنے باغیچہ میں چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک گھونی جوہری بیٹھا ہوا تھا صندوق سے گہنے نکال نکال کر دکھا رہا تھا۔ رما کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئی۔ بولی۔ آئیے بابو جی دیکھئے سیٹھ جی کیسی اچھی اچھی چیزیں لائے ہیں۔ اس ہار کے دام بارہ سو روپے بتلاتے ہیں۔

رما نے ہار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا۔ ہاں چیز تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔

رتن۔ دام بہت کہتے ہیں۔

جوہری۔ بائی جی ایسا ہار اگر کوئی دو ہزار میں لا دے تو جو جرمانہ کہئے دوں۔ میں نے تو لاگت بتلائی ہے۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ ایسا نہ کہئے سیٹھ جی جرمانہ دینا پڑے گا۔

جوہری۔ بابو جی جب ہار نو سو روپیہ میں آجائیگا اور بالکل ایسا ہی بلکہ چمک دمک میں اس سے بھی بڑھ کر۔ مگر مال پرکھنا چاہیئے۔ میں نے خود ہی آپ سے مول تول کر بات نہیں کی۔ مول تول اناڑیوں سے کیا جاتا ہے۔ آپ سے کیا مول تول۔ ہم لوگ نرے روزگاری نہیں ہیں بابو صاحب۔ آدمی کا مزاج دیکھتے ہیں۔ شریمتی جی نے کیا امیرانہ مزاج پایا ہے کہ واہ!

رتن نے ہار کو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ کچھ تو کم کیجئے سیٹھ جی۔ آپ نے تو جیسے قسم کھا لی۔

جوہری۔ کمی کا نام نہ لیجئے حضور! یہ چیز آپ کی نذر ہے۔

رتن۔ اچھا تو ایک بات بتلا دیجئے۔ کم سے کم آپ اس کا کیا لیں گے۔

جوہری نے کچھ رنجیدہ ہو کر بارہ سو روپے اور بارہ کوڑیاں ہونگی۔ حضور اسی شہر میں پندرہ سو کا بیچونگا اور آپ سے کہہ جاؤنگا کس نے لیا۔

جوہری نے ہار کو رکھنے کے لئے کیس نکالا۔ رتن کو یقین آگیا کہ یہ کچھ کم نہ کرے گا بچوں کی طرح بے صبر ہو کر بولی۔ آپ تو ایسا سمیٹے لیتے ہیں گویا ہار کو نظر لگ جائے گی جوہری۔ کیا کروں صاحب۔ جب ایسے دربار میں چیز کی قدر نہیں ہوتی تو رنج ہوتا ہے۔

رتن نے کمرے میں جا کر رما کو بلایا۔ اور بولی۔ آپ کے خیال میں یہ کچھ اور نیچے اترے گا۔

رما۔ میرے خیال میں تو چیز ایک ہزار سے زیادہ کی نہیں ہے۔

رتن۔ او نہہ ہوگا۔ میرے پاس تو چھ سو روپے ہیں۔ آپ چار سو روپے کا انتظام کر دیں تو لے لوں۔ یہ اسی گاڑی سے کاشی جا رہا ہے اُدھار نہ مانے گا۔ وکیل صاحب کسی جلسے میں گئے ہوئے ہیں۔ نو دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔ میں آپ کو کل روپیہ لوٹا دوں گی۔

رما نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ یقین مانیئے۔ میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ میں تو آپ سے روپے مانگنے آیا تھا وہ روپے مجھے دید یجیئے۔ میں آپ کے لئے یہیں سے کوئی اچھا سا ہار لاؤں گا۔ سات آٹھ سو سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

رتن۔ چلئے میں آپ کی باتوں میں نہیں آتی۔ چھ مہینے میں ایک کنگن تو بنوا نہ سکے اب ہار کیا لائیے گا۔ میں یہاں کئی دوکانیں دیکھ چکی ہوں۔ ایسی چیز شاید ہی کہیں نکلے اور نکلے گی بھی تو اس کے ڈیوڑھے دام دینے پڑیں گے۔

رما۔ تو اسے کل کیوں نہ بلا لیجئے۔ سودا بیچنے کی غرض ہوگی تو آپ ٹھہرے گا۔

رتن۔ اچھا کہیئے دیکھئے کیا کہتا ہے۔

دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ رما نے جوہری سے کہا۔ تم کل آٹھ بجے کیوں نہیں آجاتے۔

جوہری۔ نہیں حضور کل کاشی میں دو چار بڑے رئیسوں سے ملنا ہے، آج نہ جانے سے بڑا نقصان ہو جائیگا۔

رتن۔ میرے پاس تو اس وقت چھ سو روپے ہیں، باقی روپے کل لیتے ہوں تو ہار دے دیجئے۔

جوہری۔ روپے کی تو کوئی بات نہیں۔ مہینہ دو مہینہ میں لے لیتا۔ لیکن ہم پردیسیوں کا کیا ٹھکانا، کون جانے یہاں پھر کب آنا ہو۔ آپ، اس وقت ایک ہزار دے دیں۔ دو سو پھر دے دیجئے گا۔

دفعتہً موٹر کی آواز سن کر رتن نے پھاٹک کی طرف دیکھا وکیل صاحب چلے آرہے تھے۔ رتن نے آگے بڑھ کر کہا۔ آپ تو نو بجے آنے کو کہہ گئے تھے۔

وکیل۔ وہاں کورم ہی پورا نہ ہوا۔ بیٹھ کر کیا کرتا۔ کوئی دل سے تو کام کرنا نہیں چاہتا۔ سب مفت میں نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ کیا کوئی جوہری ہے۔

جوہری نے اٹھ کر سلام کیا۔

وکیل صاحب رتن سے بولے۔ کیوں تم نے کوئی چیز پسند کی۔

رتن۔ ہاں ایک ہار پسند کیا ہے۔ بارہ سو مانگتے ہیں۔

وکیل۔ بس! اور کوئی چیز پسند کرو۔

رتن۔ اس وقت تو مجھے اور کوئی چیز کی ضرورت نہیں۔

وکیل صاحب کو رتن سے شوہر کی سی محبت نہیں۔ باپ کی سی تھی جیسے کوئی محبتی باپ لڑکیوں سے پوچھ پوچھ کر کھلونے لیتا ہے وہ بھی رتن سے پوچھ پوچھ کر آرائش کے کھلونے لیتے تھے۔ ان کے پاس اسے خوش کرنے کے لئے دولت کے سوا اور چیز ہی کیا تھی۔ انہیں اپنی زندگی میں ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک مجسم سہارے کی۔ جس کی قوت سے وہ اس عالم ضعیفی میں بھی کارزار ہستی میں کھڑے رہ سکیں۔

جیسے کسی بڈھے کو لاٹھی کی ضرورت ہوتی ہے یا کسی اُپاسک کو مُورتی کی۔ بغیر مورتی کے وہ کس پر پھول چڑھائے۔ کسے گنگا جل سے نہلائے۔ کسے لذیذ چیزوں کا بھوگ لگائے۔

رتن نے کیس میں سے ہار نکال کر دکھایا۔ اور بولی۔ اس کے بارہ سو مانگتے ہیں

وکیل صاحب کی نگاہ میں روپے کی قیمت اس سے پیدا ہونے والی خوشی تھی۔ اگر ہار رتن کی پسند ہے تو انہیں اس کی پرواہ نہیں کہ اس کے کیا دینے پڑیں گے۔ اُنہوں نے چیک بک نکال کر جوہری کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ سچ سچ بولو۔ کتنا لکھوں اور اگر فرق پڑا تو تم جانو گے۔

جوہری نے ہار کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ساڑھے گیارہ سو کر دیجئے

وکیل صاحب نے چیک لکھ کر اس کو دیا اور سلام کر کے رخصت ہوا۔

رما کچھ دیر تو بیٹھا وکیل صاحب کے سیاحتِ یورپ کے تذکرے سنتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر چلا آیا۔

## (۳۱)

اگر اس وقت کسی کو دنیا میں سب سے زیادہ فکرمند مصیبت زدہ اور زندگی سے بیزار انسان کی صورت دیکھنی ہو تو اس نوجوان کو دیکھے جو سائیکل پر بیٹھا ہوا الفریڈ پارک کے سامنے چلا آرہا ہے۔ اس وقت اگر کوئی کالا سانپ نظر آئے تو وہ غالباً دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے گلے سے لگائے گا۔ اور اس کے زہر کو امرت کی طرح پیئے گا۔ اس کی نجات اب امرت میں نہیں زہر ہی میں ہے۔ موت ہی اب اس کی فکروں کا خاتمہ کر سکتی ہے لیکن کیا موت اسے زندگی سے بھی بچا سکتی ہے اگر رما ناتھ اس وقت بھی جا کر جالپا سے سارا واقعہ بے کم و کاست

کہہ سناتا تو وہ اس کے ساتھ ضرور ہمدردی کرتی۔ یقیناً وہ اپنے سارے زیور اس کے سپرد کر دیتی۔ ان زیوروں کو گروی رکھ کر سرکاری روپے ادا کر دیتا۔

دل میں یہی فیصلہ کر کے رما گھر کی طرف چلا لیکن گھر پہنچ کر اس نے سوچا جب یہی کرنا ہے تو جلدی کیا ہے، جب چاہو نگا مانگ لوں گا۔ کچھ دیر گپ شپ کرتا رہا تب کھانا کھا کر لیٹا دفعتہً اس کے جی میں آیا کیوں نہ چپکے سے کوئی چیز اٹھا لے جاؤں خاندانی وقار کی حفاظت کرنے کے لئے اس نے ایک بار یہ چال چلی تھی، اسی نسخہ سے کیا وہ اپنی جان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اپنی زبان سے تو شاید وہ کبھی اپنا پردہ فاش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شش و پنج میں پڑے سویرا ہو جائے گا اور تب اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔

مگر اندیشہ ہوا کہیں جالپا کی آنکھ نہ کھل جائے، پھر تو اس کے لئے ترمینی کے سوا اور کوئی جگہ ہی نہ رہے گی، جو کچھ بھی ہو ایک بار کوشش کرنا شرط ہے اس نے آہستہ آہستہ جالپا کا ہاتھ اپنے سینے پر سے ہٹایا اور چارپائی سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایسا شبہ ہوا کہ جالپا ہاتھ اٹھاتے ہی چونکی۔ لیکن پھر معلوم ہوا یہ محض شبہ تھا۔ اب اسے جالپا کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالنا تھا۔ دیر کرنے کا موقع نہ تھا لیکن نیند میں بھی حواس ثانی قائم رہتے ہیں، بچہ کتنا ہی غافل سویا ہو، ماں کے چارپائی سے اٹھتے ہی جاگ پڑتا ہے، جب وہ چابی نکالنے کے لئے جھکا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ جالپا مسکرا رہی ہے اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور لیمپ کی ہلکی روشنی میں جالپا کے منہ کی طرف تاکنے لگا۔ جالپا کا رہ رہ کر مسکرانا بتلا رہا تھا کہ وہ کوئی دلیرانہ خواب دیکھ رہی ہے۔ اس تبسم نے گویا رما کے دل کو منور کر دیا۔ اس محبت اور وفا کی دیوی کے ساتھ وہ کتنا کمینہ پن کر رہا ہے، جس وقت اسے معلوم ہو گا کہ اس کے گہنے پھر چوری ہو گئے اس

کی کیا حالت ہو گی، وہ کن آنکھوں سے اُسے چھاتی پیٹتے اور سر کے بال نوچتے دیکھے گا۔

وہ پھر چارپائی پر لیٹے رہا۔ اسی وقت جالپا کی آنکھیں کھل گئیں اس کے منہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ تم کہاں گئے تھے؟ میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہی تھی ایک بڑا سا باغ ہے ہم تم دونوں اس میں ٹہل رہے ہیں۔ اتنے میں تم نہ جانے کہاں جاتے ہو اور ایک سادھو آ کر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت بالکل دیوتاؤں جیسی ہے وہ مجھ سے کہتا ہے بیٹی! میں تم سے بہت خوش ہوں مجھ سے جو چاہے مانگ لے۔ میں تمہیں اِدھر اُدھر ڈھونڈ رہی ہوں کہ تم سے پوچھ کر کچھ مانگوں۔ پر تم کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ میں سارا باغ چھان آئی درختوں کی آڑ میں دیکھا تم نہ جانے کہاں چلے گئے ہو۔ ہاں اتنے میں نیند کھل گئی کچھ مانگنے نہ پائی۔

رما نے مسکرا کر کہا، کیا مانگتیں۔

جالپا۔ مانگتی جو جی میں آتا۔ تمہیں کیوں بتاؤں۔

رما۔ میں سمجھ گیا، تم بہت سی دولت مانگتیں۔

جالپا۔ دولت کو تو تم بہت بڑی چیز سمجھتے ہو گے میں تو کچھ نہیں سمجھتی۔

رما۔ ہاں میں تو سمجھتا ہوں، مفلس رہ کر جینا مرنے سے بھی زیادہ بدتر ہے میں تو اگر کسی دیوتا کو پکڑ پاؤں تو بغیر کافی روپے لئے نہ چھوڑوں۔ میں سونے کی دیوار نہیں کھڑی کرنا چاہتا۔ نہ راک فیلر اور کارنیگی بننے کی مجھے ہوس ہے۔ میں صرف اتنی دولت چاہتا ہوں کہ روزمرہ کی ضرورتوں کے لئے ترسنا نہ پڑے۔ بس کوئی دیوتا مجھے پانچ لاکھ روپے دے دے تو میں پھر اس سے کچھ نہ مانگوں گا۔ ہمارے غریب ملک میں ایسے کتنے ہی رئیس ہیں جو پانچ لاکھ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔

میں تو اتنے میں ساری عمر کی غلامی لکھنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے کوئی اتنا بھی نہیں دیتا۔

جالپا۔ مجھے تو اتنے روپے ملیں تو میں یہی سوچتی ہوں کہ اسے خرچ کیسے کروں

رما۔ تو پھر تم کیا مانگتیں۔ اچھے اچھے گہنے۔

جالپا نے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کیوں چڑھاتے ہو مجھے کیا میں گہنوں پر اور عورتوں سے زیادہ جان دیتی ہوں۔ میں نے تو کبھی تم سے ضد نہیں کی۔ تمہیں ضرورت ہو تو آج اٹھا لے جاؤ۔ مجھے مطلق ملال نہ ہوگا۔

رما نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا تو پھر بتاتی کیوں نہیں۔

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں یہی مانگتی کہ تم ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہو۔ تمہارا دل مجھ سے کبھی برگشتہ نہ ہو۔

رما نے ہنس کر کہا۔ اچھا تو کیا تمہیں یہ خوف بھی ہے۔

جالپا۔ اوروں کی حالت دیکھ کر مجھے بھی کبھی یہ خوف ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی عورت نہ ملی جس نے اپنے شوہر کی بے مہری اور بے التفاتی کا قصہ نہ کہا ہو۔

یہ کہتے ہوئے جالپا نے رما کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پیار میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ سچ بتانا تم اب بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو جتنا پہلے چاہتے تھے۔

رما نے جالپا کو گلے سے لگا کر کہا۔ اس سے کہیں زیادہ لاکھ گنا۔

جالپا نے ہنس کر کہا۔ بالکل جھوٹ سولہوں آنہ جھوٹ۔

رما۔ یہ تمہاری زبردستی ہے۔ آخر یہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا۔

جالپا۔ کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں۔ تم نے میرے پاس بیٹھنے کی قسم کھائی ہے جب دیکھو گم سم بیٹھے رہتے ہو۔ مجھ سے محبت ہوتی تو مجھ پر اعتبار کیا ہوتا۔ جس سے تم اپنے دل کی بری بات نہ کہہ سکو۔ اس سے تمہیں محبت نہیں ہو سکتی تم

اس کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہو۔ عیش کر سکتے ہو۔ اسی طرح جیسے کوئی بازاری عورتوں کے پاس جاتا ہے وہاں آدمی زندگی کا لطف اٹھانے کے لئے ہی جاتا ہے۔ اپنے دل کا دکھ کہنے نہیں جاتا۔ میرے ساتھ تمہارا یہی سلوک ہے بولو ہے یا نہیں! کیا میں دیکھتی نہیں کہ تم باہر سے کچھ پریشان آتے ہو، باتیں کرتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے دل کہیں اڑا ہوا ہے کھانا بھی اسی طرح کھاتے ہو، جیسے بیگار ٹالتے ہو۔ کیا میں یہ ساری باتیں نہیں دیکھتی، تمہارے خیال سے مجھے دیکھنا نہ چاہیئے، تم صرف میرے حُسن کے شیدا ہو۔ میرا کام ہے سیر و تفریح کرنا۔ آرائش میں مصروف رہنا۔ مجھے تمہاری فکروں سے کوئی سروکار نہیں ہے مگر کیا کروں مجھے ایشور نے وہ دل نہیں دیا ہے۔

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جالپا نے اس کی فطرت کا اتنا صحیح مطالعہ کیا ہے اُس کا اُسے گمان بھی نہیں ہے۔ فی الواقعہ وہ اس کے حُسن کا شیدائی تھا کبھی اس کا حسنِ باطن دیکھنے کی کوشش نہ کی۔

اگر اس کی صورت اتنی دلکش نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے بولنا پسند نہ کرتا۔ اس کی ساری کشش، اس کی ساری مسرت جالپا کے حسن میں مرکوز تھی۔ وہ سمجھتا تھا جالپا اسی میں خوش ہے۔ اپنے فکروں کے بوجھ سے وہ اسے دبانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر آج اس پر روشن ہوا کہ اس کی حُسن پرستی جالپا کو آسودہ نہیں کر سکتی۔ وہ اس کی شریک درد ہونے کے لئے بے قرار ہے۔ اس وقت اسے اپنا درد دل کہہ ڈالنے کا اچھا موقعہ تھا لیکن شرم نے پھر اسکی زبان بند کر دی۔ جو باتیں وہ اتنے دنوں سے چھپائے ہوئے تھا۔ وہ اب کیسے کہے۔ کیا ایسا کرنا جالپا کے الزاموں کو صحیح تسلیم کرنا ہوگا۔

رما انہیں خیالوں میں پڑا پڑا سو گیا۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی، سویا تو اس ارادے سے تھا کہ بہت سویرے اٹھ جاؤں گا لیکن نیند کھلی تو کمرے میں روشنی پھیل چکی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھا۔ اور بغیر ہاتھ منہ دھوئے کپڑے پہن کر رمیش بابو کے یہاں

جانے کو تیار ہو گیا۔ انہیں اب محرم راز بنانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جالپا اس وقت کھانا بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ رما کو اس طرح جاتے دیکھ کر اس کے چہرہ کی طرف پرسوال نظروں سے دیکھا۔ رما کے چہرہ پر اضطراب اور کلفت اور خوف کی کیفیت نمایاں تھی۔ ان کی یہ کیا حالت ہے؟ اس سے وہ کچھ کہتے کیوں نہیں۔ وہ اور کچھ نہ کر سکے ہمدردی تو کر ہی سکتی ہے۔ تسکین تو دے ہی سکتی ہے۔ اس کے جی میں آیا رما کو پکار کر پوچھے کیا بات ہے۔ اٹھ کر دروازے تک آئی بھی لیکن رما تھ سڑک پر دور نکل گیا تھا۔ اس نے دیکھا وہ بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے جیسے نشہ میں ہو۔ نہ داہنی طرف تاکتا ہے نہ بائیں طرف، صرف سر جھکائے راہ گیروں سے ٹکراتا۔ تانگہ اور موٹر کی پرواہ نہ کرتا ہوا بھاگا چلا جا رہا تھا وہ ایک محویت کے عالم میں کئی منٹ تک دروازے پر کھڑی رہی پھر اندر آ کر کھانا بنانے لگی۔ لیکن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ کیا بات ہے۔ وہ اس سے کیوں اتنا چھپاتے ہیں۔

رما رمیش کے گھر پہنچا تو آٹھ بج گئے تھے۔ بابو صاحب چوکی پر بیٹھے سندھیا کر رہے تھے انہیں دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد سندھیا سے فارغ ہو کر بولے۔ کیا ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔ یہی لیچڑپن مجھے ناپسند ہے اور کچھ نہ کرو جسم کی صفائی کا تو خیال رکھو۔ کیا ہوا روپیہ کا کچھ انتظام ہوا۔

رما نے دل پر جبر کر کے کہا۔ اسی فکر میں تو آپ کے پاس آیا ہوں۔

رمیش۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر منشی جی سے کہتے کیوں شرم آتی ہے یہی تو ہوگا کچھ سخت سست کہیں گے۔ لیکن اس بلا سے تو نجات مل جائے گی۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے ایسے حادثے زندگی میں ہوتے رہتے ہیں۔ لاؤ میں چلو میں کہے دیتا ہوں۔

رما۔ ان سے کہنا ہوتا تو کبھی کا کہہ چکا ہوتا۔ کیا آپ کوئی بندوبست نہیں

کر سکتے۔

رینش۔ کر کیوں نہیں سکتا، مگر کرنا نہیں چاہتا۔ ایسے آدمی کے ساتھ مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ جو بات تم مجھ سے کہہ سکتے ہو، کیا ان سے نہیں کہہ سکتے، پہلے ان سے کہو اگر روپے نہ دیں تب میرے پاس آنا۔ اس بے التفاتی نے رما کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اتنی یگانگت کے باوجود یہ بیدردی! اس کے منہ سے کوئی دوسرا لفظ نہ نکلا، وہاں سے اٹھ کر چلا۔ مگر کچھ سود نہ پڑتا تھا۔ جدائی میں آسمان سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی جو حالت ہوتی ہے وہی حالت اس رما کی تھی۔ دس قدم تیزی سے آگے بڑھتا تو پھر کچھ سوچکر رک جاتا، اور دس پانچ قدم پیچھے لوٹ جاتا۔ کبھی اس گلی میں گھس جاتا۔ کبھی اس گلی میں۔ دفعتہً ایک ترکیب سوجھی۔ کیوں نہ جالپا کو ایک رقعہ لکھ کر سارا ماجرا کہہ سنائے، زبان سے تو وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا مگر قلم سے لکھنے میں اسے مشکل نہ ہوتی تھی۔ اس نے سوچا رقعہ لکھکر جالپا کو دے دونگا اور باہر کے کمرے میں آبیٹھوں گا۔ زبانی گفتگو کا موقعہ ہی نہ آنے دونگا۔ وہ بھاگا ہوا گھر آیا اور فوراً یہ رقعہ لکھا۔

جانِ من کیا کہوں، کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایک گھنٹہ کے اندر تین سو روپے کا انتظام نہ ہو سکا تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑجائیں گی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ کسی سے قرض لے لونگا، مگر کوئی صورت نہ نکلی۔ اگر تم اپنے دو ایک زیور دیدو تو میں گرو رکھ کر کام نکال لوں، جیوں ہی روپے ہاتھ آجائیں گے چھڑا دونگا اگر مجبوری نہ آپڑتی تو تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ ایشور کے لئے ناراض نہ ہونا۔ میں نے تم سے اب تک راز کو چھپایا اس کا مجھے افسوس ہے۔

ابھی یہ خط پورا نہ ہوا تھا کہ رینش بابو مسکراتے ہوئے آکر بیٹھ گئے اور بولے
کہا ان سے تم نے؟

رما نے سر کھجلا کر کہا۔ ابھی تو موقعہ نہیں ملا۔

رمیش۔ تو کیا دو چار دن میں موقعہ ملے گا؟ میں ڈرتا ہوں کہ آج بھی کہیں خالی ہاتھ نہ چلے جاؤ۔ نہیں تو غضب ہی ہو جائے۔

رما۔ جب ایک بات دل میں طے کر لی تو اب کیا فکر؟

رمیش۔ آج موقعہ ملے تو ذرا رتن کے پاس چلے جانا۔ اس دن میں نے کتنا زور دیکر کہا تھا لیکن شاید تم بھول گئے۔

رما۔ بھول تو نہیں گیا تھا۔ ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمیش۔ واہ رے آپ کی شرم۔ ذلیل تو وہ مجھے سمجھیں گی تمہیں کاہے کو شرم۔ آج دفتر سے لوٹ کر ضرور چلے جانا۔ ذرا زبان ہلا دینے سے کسی غریب کا کام نکلتا ہو تو ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔

رمیش بابو چلے گئے تو رما نے رقعہ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور اندر داخل ہوا۔ جالپا آج کسی سہیلی کے گھر جانے کو تیار تھی۔ تھوڑی دیر ہوئی بلاوا آیا تھا اپنی بہترین ساڑھی پہنے تھی، ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن زیب دے رہے تھے گلے میں چندن ہار جھلا رہا تھا آئینہ سامنے رکھے کانوں میں جھومک پہن رہی تھی۔ کچھ روکھے پن سے بولی۔ آج سویرے کہاں چلے گئے تھے ہاتھ منہ تک نہ دھویا۔ دن بھر تو باہر رہتے ہی ہو۔ شام سویرے تو گھر پر رہا کرو۔ تم نہیں رہتے تو گھر سُونا سُونا لگتا ہے۔ میں ابھی سوچ رہی تھی مجھے میکے جانا پڑے تو میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ میرا جی تو وہاں بالکل نہ لگے۔

رما۔ تم تو کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہو؟

جالپا۔ سیٹھانی جی نے بلا بھیجا ہے۔ دوپہر تک چلی آؤں گی۔

اس وقت رما کی حالت اس شکاری کی سی تھی جو ہرنی کو اپنے بچوں کے

ساتھ کلیلیں کرتے دیکھ کر تنی ہوئی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ لیتا ہے اور یہ مادرانہ محبت کا نظارہ دیکھنے میں محو ہو جاتا۔

اسے اپنی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ کر جالپا نے کہا۔ دیکھو مجھے نظر نہ لگا دینا۔ میں تمہاری آنکھوں سے بہت ڈرتی ہوں۔

رما ایک ہی پرواز میں موجودات کی دنیا سے شعر اور تخیل کی دنیا میں جا پہنچا۔ ایسے موقعہ پر جب جالپا کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ کیا وہ اپنا خط دے کر اس کی حسرتناک سرگرمیوں کو خاک میں ملائے گا۔ وہ کونسا بے رحم صیاد ہے جو چہکتی ہوئی چڑیا کی گردن پر چھری چلا دیگا۔ وہ کونسا مردہ دل آدمی ہے جو کسی گل نورس کو توڑ کر پیروں میں کچل دے گا۔ رما اتنا بے رحم اور مردہ دل نہیں ہے وہ کتنی ہی بڑی مصیبت میں کیوں نہ گرفتار ہو جائے اس کی کتنی ہی رسوائی ہو۔ اس کی زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے مگر وہ اتنا بے حس نہیں ہو سکتا۔ اس نے مدہوش ہو کر کہا۔ نظر تو نہ لگاؤں گا۔ ہاں سینے سے لگا لونگا۔ اسی ایک جملہ میں اس کی ساری پریشانیاں اور ساری مشکلیں نظر ہو گئیں۔ وہ اس نادان بچے کی طرح تھا جو پھوڑے پر نشتر کی عارضی تکلیف کو نہ برداشت کر کے اس کے پھوٹنے ناصور پڑنے مہینوں چارپائی پر پڑے رہنے کی تکلیف منظور کر لیتا ہے۔

جالپا نیچے جانے لگی تو رما نے فرط محبت سے اسے گلے لگا لیا اور اس طرح بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا گویا محبت کے خزانے کو آج ہی لٹا دیگا۔ کون جانتا ہے یہی اس کی آخری ملاقات ہے۔

دفعتہً جالپا بولی۔ مجھے کچھ روپے تو دیدو۔ شاید وہیں ضرورت پڑے۔

رما نے چونک کر کہا۔ روپے۔ روپے تو اس وقت نہیں ہیں۔

جالپا۔ نہیں ہیں۔ مجھ سے بہانہ کر رہے ہو۔ بس مجھے دو سو روپیہ دیدو۔

زیادہ نہیں چاہتی!

یہ کہہ کر اس نے رما کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور کچھ پیسوں کے ساتھ وہ رقعہ بھی نکال لیا۔

رما نے ہاتھ بڑھا کر رقعہ کو جالپا کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر کے کہا۔ کاغذ مجھے دے دو سرکاری کاغذ ہے۔

جالپا۔ کس کا خط ہے بتا دو!

پھر اس نے تہ کئے ہوئے پرزے کو کھول کر کہا۔ یہ سرکاری کاغذ ہے۔ جھوٹے کہیں کے تمہارا ہی لکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رما۔ دے دو۔

رما نے پھر کاغذ چھین لینا چاہا۔ مگر جالپا نے ہاتھ پیچھے کر کے کہا۔ میں بغیر پڑھے نہ دوں گی۔ زیادہ مندکرو گے تو پھاڑ ڈالونگی۔

رما۔ اچھا پھاڑ ڈالو۔

جالپا۔ تب تو میں ضرور پڑھوں گی۔

اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر پرزہ کو کھولا اور پڑھنے لگی۔

رما نے دوبارہ اس کے ہاتھ سے رقعہ چھیننے کی کوشش کی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا آسمان پھٹ پڑا ہے گویا کوئی خوفناک جانور اسے نگلنے چلا آرہا ہے۔ وہ دھم دھم کرتے ہوئے اوپر سے اترا اور باہر چلا گیا۔ کہاں اپنا منہ چھپائے کہاں روپوش ہو جائے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ اس کی حالت کسی برہنہ تن آدمی کی سی تھی۔ افسوس سارا پردہ کھل گیا اس کی ساری دروغ بافیوں کا پردہ فاش ہو گیا۔ جن باتوں کو جالپا سے اس نے چھپانے کی کوشش کی۔ ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں وہ آج اس کے منہ پر سیاہ داغ بن کر اس کی تشہیر کر رہی تھیں۔ وہ اب یہاں رہ کر اپنی ذلت اپنی

آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ جالپا کی سسکیاں، منشی جی کی جھڑکیاں، ہمسایوں کی چٹکیاں۔ سننے سے مرجانا کہیں آسان تر تھا جب وہ اس دنیا میں نہ رہے گا تو اسے اس کی کیا پروا ہوگی کہ کوئی اسے کیا کہہ رہا ہے۔ ہائے! محض تین سو روپوں کے لئے اس کا ستیاناس ہوا جا رہا ہے۔

جالپا اسے کتنا بدنیت، کتنا مکار، کتنا فتنہ ساز سمجھ رہی ہوگی۔ کیا وہ اسے اپنا منہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں وہ ایک نئی زندگی کا نقشہ بنالے۔ جہاں وہ دنیا سے الگ تھلگ سب سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کے دن کاٹ سکے جہاں وہ اس طرح چھپ جائے کہ پولیس اس کا پتہ نہ پا سکے۔ گنگا کی گود کے سوا ایسی جگہ اور کہاں ہے اگر زندہ رہا تو مہینہ دو مہینہ میں ضرور ہی پکڑ لیا جائے گا۔ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے عدالت میں کھڑا ہوگا سپاہیوں کی ایک فوج اسے گھیرے میں لئے کھڑی ہوگی۔ سارے شہر کے آدمی اس کا تماشہ دیکھ رہے ہونگے۔ انہیں میں جالپا بھی ہوگی۔ رتن بھی ہوگی۔ اس کے ماں باپ، عزیز و اقارب دوست آشنا بھی مختلف انداز سے اس کی ذلت کا تماشہ دیکھیں گے۔ نہیں وہ اپنی مٹی یوں خراب نہ کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ڈوب مرے۔ مگر پھر خیال آیا کہ جالپا کا کیا حشر ہوگا۔ ماں باپ تو رو دھو کر صبر کر لیں گے مگر اس کا دستگیر کون ہوگا کیا وہ چھپ کر کہیں نہیں رہ سکتا۔ کیا شہر سے دور چھوٹے گاؤں میں وہ روپوش نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کبھی جالپا کو اس پر رحم آجائے اس کی خطائیں معاف کر دے۔ کیا عجب ہے کبھی اس کے دن پھریں۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس کے سامنے آنکھیں سیدھی کر سکے۔ نہ جانے اس وقت جالپا کی کیا حالت ہوگی۔ شاید اس رقعہ کا مطلب سمجھ گئی ہو۔ شاید صورت کا اس نے صحیح اندازہ کر لیا ہو۔ شاید اس نے جاگیشری کو وہ رقعہ دکھایا ہو اور دونوں گھبرائی ہوئی اُسے تلاش کر رہی ہوں۔

شاید منشی جی کو بلانے کے لئے لڑکوں کو بھیجا ہو۔ چاروں طرف اس کی تلاش ہو رہی ہوگی اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ادھر بھی نہ آتا ہو۔ شاید موت کو بھی سامنے دیکھ کر وہ اتنا بدحواس نہ ہوتا جتنا کسی صورت آشنا کو دیکھ کر۔ آگے پیچھے چوگنی نگاہوں سے تاکتا ہوا وہ اس جلتی دھوپ میں چلا جا رہا تھا کچھ خبر نہیں کہاں۔ دفعتہً ریل کی سیٹی سن کر وہ چونک پڑا۔ ارے میں اتنی دور نکل آیا۔ ریل گاڑی سامنے کھڑی تھی گاڑی نے گویا زبردستی اسے اپنی طرف کھینچ لیا جیسے اس میں بیٹھتے ہی اس کی ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ مگر حبیب میں روپے نہ تھے صرف انگلی میں ایک انگوٹھی پڑی ہوئی تھی اس نے قلی کو بلا کر کہا۔ کیوں بھائی یہ انگوٹھی بیچ کر لا سکتے ہو۔ ایک روپیہ تمہیں دونگا مجھے گاڑی میں جانا ہے گھر سے روپے لے کر چلا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں گر گئے۔ روپے لینے کے لئے گھر جاؤں تو گاڑی نہ ملے گی اور بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔

قلی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سمجھ گیا کوئی ضرور ملزم ہے۔ انگوٹھی لی اور اسٹیشن کے اندر چلا گیا۔ رما ٹکٹ گھر کے سامنے ٹہلنے لگا آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مگر دس منٹ گذر گئے قلی کا کہیں پتہ نہیں۔ کہاں چلا گیا کم بخت! انگوٹھی لے کر غائب تو نہ ہو جائے گا۔ اسٹیشن کے اندر جا کر اسے تلاش کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں قلی کا نمبر تک نہ دیکھا تھا۔ ادھر گاڑی چھوٹی جا رہی تھی۔ رما سے صبر نہ ہو سکا سمجھ گیا قلی نے چرکا دیا۔ بغیر ٹکٹ لئے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھا۔ دل میں طے کر لیا صاف کہہ دونگا کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ اگر اترنا بھی پڑا تو یہاں سے دس پانچ کوس تو چلا ہی جاؤں گا۔

جب گاڑی روانہ ہو گئی تو رما کو اپنی خستہ حالی پر رونا آگیا۔ نہ جانے اُسے کبھی لوٹنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ یہ رنگ رلیوں کے دن گئے۔ ہمیشہ کے لئے اسی طرح

دنیا سے منہ چھپائے گوشہ گمنامی میں چھپا ہوا وہ ایک دن مرجائے گا۔ کوئی اسکی میت پر آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔ گھر والے بھی رو دھو کر خاموش ہو جائیں گے۔ اور اس کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ محض اپنی حماقت سے اس نے شروع ہی سے چالپا کو اپنا محرم راز بنالیا ہوتا تو آج اُسے منہ میں کالکھ لگا کر کیوں بھاگنا پڑتا۔

ابھی گاڑی کو چلے دس منٹ بھی نہ گزرے ہونگے کہ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ٹکٹ بابو اندر آیا۔ رما کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایک لمحہ میں یہ مردود اس کے پاس آجائے گا۔ اتنے آدمیوں کے سامنے اسے کتنی ندامت ہوگی اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جیوں جیوں ٹکٹ بابو اس کے قریب آتا تھا اس کے نفس کی حرکت تیز ہوتی جاتی تھی۔ آخر بلا سر پر آہی گئی۔ ٹکٹ بابو نے پوچھا، آپ کا ٹکٹ؟

رما نے مصنوعی اطمینان سے کہا، میرا ٹکٹ تو قلی کے پاس ہی رہ گیا۔ اس کو ٹکٹ لانے کے لئے روپیہ دیا تھا نہ جانے کدھر نکل بھاگا۔

ٹکٹ بابو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ آپ کو اگلے اسٹیشن پر اترنا ہوگا۔ آپ کہاں جارہے ہیں۔

رما۔ سفر تو بڑی دور کا ہے۔ کلکتہ تک جانا ہے۔

ٹکٹ بابو۔ اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ لے لیجئے گا۔

رما۔ یہی تو مشکل ہے۔ میرے پاس ۲۵ روپے کا نوٹ تھا۔ کھڑکی پر بھیڑ تھی۔ میں نے نوٹ ایک قلی کو ٹکٹ لانے کے لئے دیدیا۔ مگر وہ ایسا غائب ہوا کہ لوٹا ہی نہیں شاید آپ اسے پہچانتے ہوں۔ لمبا تڑنگا چیک رو آدمی ہے۔

ٹکٹ بابو۔ اس کے متعلق آپ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ مگر بلا ٹکٹ سفر نہیں کر سکتے۔

رما نے انکسار کے ساتھ کہا۔ بھائی صاحب آپ سے کیا چھپاؤں میرے پاس

اور روپے نہیں ہیں۔

ٹکٹ بابو۔ مجھے افسوس ہے بابو صاحب ہم قاعدہ سے مجبور ہیں۔

کمرے کے سارے مسافر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ تیسرا درجہ زیادہ تر مزدور بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک بابو طبقے کے مخلوق کو ذلیل ہوتے دیکھ رہے تھے شاید ٹکٹ بابو رما کو دھکے دے کر نیچے گرا دیتا تو وہ اور خوش ہوتے۔ رما کو کبھی اپنی زندگی میں اتنی ذلت نہ ہوئی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی زندگی کے اس نئے سفر کا آغاز ہوا ہے کون جانے آگے کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔ کس کس کے ہاتھوں دھوکا کھانا پڑے گا۔ اس کے جی میں آیا گاڑی سے کود پڑوں۔ اس چھیچھالیدر سے تو مرجانا کہیں اچھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کھڑکی سے باہر سر نکال کر رونے لگا۔

دفعتہً ایک بوڑھے آدمی نے جو اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا پوچھا۔ کلکتہ میں کہاں جاؤ گے بابو جی!

رما نے سمجھا یہ گنوار مجھے بنا رہا ہے جھنجلا کر بولا۔ تم سے مطلب میں کہاں جاؤں گا۔

بوڑھے نے اس کی بدمزاجی پر دھیان نہ دیا۔ بولا۔ میں بھی وہیں چلونگا بابو جی! ہمارا تمہارا ساتھ ہو جائیگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ کرائے کے لئے روپے مجھ سے لے لو۔ پھر وہاں دے دینا۔

اب رما کو اس پر کچھ اعتبار ہوا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا کوئی ساٹھ ستر سال کا بوڑھا گھلا ہوا آدمی تھا۔ گوشت تو کیا ہڈیاں تک گل گئی تھیں۔ مونچھ اور سر کے بال منڈے ہوئے تھے ایک چھوٹی سی تسبیح کے سوا اس کے پاس اور کوئی اثاثہ بھی نہ تھا۔

رما کو اپنی طرف تاکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ آپ ہوڑے ہی اتریں گے یا کہیں

اور جائیں گے؟

رمانے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ بابا! میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤنگا روپے کا کوئی انتظام کر کے پھر آؤں گا۔

بوڑھا۔ تمہیں کتنے روپے چاہئیں مجھ سے لے لو۔ میں بھی تو وہیں چل رہا ہوں جب چاہے دے دینا۔ کیا میرے دس پانچ روپے لے کر بھاگ جاؤ گے۔ گھر کہاں ہے رما۔ میں الہ آباد میں رہتا ہوں۔

بوڑھے نے عقیدت کے جوش سے کہا۔ پراگ راج کی کیا بات ہے، میں بھی ترپنی کا اشنان کر کے آرہا ہوں، سچ سچ دیوتاؤں کی پوری ہے تو کتنے روپے نکالوں رمانے شرماتے ہوئے کہا۔ میں چلتے ہی چلتے روپے نہ دے سکونگا، یہ سمجھ لو۔

بوڑھا مسکرا کر بولا۔ بھیا میرے دس پانچ روپے لے کر تم بھاگ تھوڑے ہی جاؤ گے؟ میں نے تو دیکھا پراگ کے پنڈے جاتریوں کو بنا لکھا پڑھی کے روپے دے دیتے ہیں دس روپے میں تمہارا کام چل جائے گا۔

رمانے سر جھکا کر کہا، ہاں اتنے کافی ہیں۔

ٹکٹ بابو کو کرایہ دے کر رما سوچنے لگا۔ یہ بوڑھا کتنا صاف دل، کتنا بے لوث کتنا نیک نیت واقع ہوا ہے، جو لوگ مہذب کہلاتے ہیں ان میں کتنے آدمی ایسے نکلیں گے جو اتنی فراخدلی سے کسی مسافر کی مدد کر سکیں!

دورانِ گفتگو میں رما کو معلوم ہوا کہ بوڑھا ذات کا کھٹک ہے، کلکتہ میں اس کی سبزی کی دکان ہے۔ اس کا وطن تو بہار ہے، مگر چالیس سال سے کلکتے ہی میں دکان کر رہا ہے۔ دیبی دین نام ہے اس وقت بدری ناتھ کی یاترا کر کے لوٹا جا رہا ہے۔

رمانے تعجب سے پوچھا۔ تم بدری ناتھ کی یاترا کر آئے۔ وہاں تو پہاڑوں کی بڑی پڑھائیاں ہیں۔

دیبی۔ بھگوان کی مرضی ہوتی ہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے بابوجی۔ انکی نگاہ چاہیئے۔

رما۔ تمہارے بال بچے تو کلکتہ ہی میں ہونگے۔

دیبی دین نے دردناک تبسم سے کہا۔ بال بچے تو سب بھگوان کے گھر چلے گئے۔ چار بیٹے تھے دو لڑکوں کا تو بیاہ ہو چکا تھا سب چل دیئے۔ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اتنے بوئے ہوئے بیج کو کسان ہی کاٹتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور بولا۔ بڑھیا ابھی جیتی ہے۔ دیکھیں ہم دونوں میں پہلے کون چلتا ہے وہ کہتی ہے پہلے میں جاؤں گی۔ میں کہتا ہوں پہلے میں جاؤں گا۔ دیکھیں دونوں میں کس کی ٹیک رہتی ہے۔ تم کبھی آنا تو دکھاؤں گا اب بھی اسے گہنوں کا شوق ہے۔ سونے کی بالیاں اور سونے کی ہنسلی پہنے دکان پر بیٹھی رہتی ہے۔ جب کہا تیرتھ کر آویں تو بولی۔ تمہارے تیرتھ کے لئے کیا اپنی دکان مٹی میں ملا دوں۔ آدمی کی ہوس ایسی ہوتی ہے۔ "آج مرے کل دوسرا دن" مگر دوکان نہ چھوڑے گی۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ نہ کوئی رونے والا نہ کوئی ہنسنے والا۔ مگر ہوس نہیں جاتی۔ اب بھی کوئی نہ کوئی گہنہ بنواتی رہتی ہے نہ جانے کب اس کا پیٹ بھرے گا۔ گھر گھر یہی حال ہے جہاں دیکھو ہائے گہنے! ہائے گہنے! گہنے کے پیچھے جان دے دیں۔ گھر کے آدمیوں کو بھوکا ماریں۔ گھر کی چیزوں کو کوڑا کر دیں اور کہاں تک کہوں۔ اپنی آبرو تک بیچ دیں۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب کو یہی روگ لگا ہوا ہے۔ کلکتہ میں کہاں کام کرتے ہو بھیّا۔

رما۔ ابھی تو جا رہا ہوں قسمت آزمانے۔ دیکھوں کوئی نوکری چاکری ملتی ہے یا نہیں!

دیبی۔ تو پھر میرے ہی یہاں ٹھہرنا۔ نیچے دو کوٹھریاں ہیں اور ایک دالان۔ اوپر ایک کوٹھری اور چھت ہے آج بیچ دوں تو دس ہزار ملیں۔ اوپر والی کوٹھری

تمہیں دے دونگا۔ جب کہیں کام مل جائے اپنا گھر لے لینا۔ پچاس سال ہوئے گھر سے بھاگ کر ہو ڑے گیا تھا دانے دانے کو محتاج تھا تب سے سکھ بھی دیکھے دکھ بھی دیکھے اب تو یہی کہتا ہوں بھگوان لے چلو۔ بڑھیا جیتی رہے نہیں اس کی دکان کون لے گا گھر کون لے گا اور گہنے کون لے گا۔

یہ کہہ کر دیبی دین پھر ہنسا، وہ اتنا زندہ دل اتنا خوش مزاج تھا کہ رما کو تعجب ہو رہا تھا۔ بے بات کی بات پر ہنستا تھا جس بات پر اور لوگ روتے ہیں اس پر اُسے ہنسی آتی تھی، اتنی ہی دیر میں اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان کہہ سنائی۔ کتنے ہی لطیفے یاد تھے، بات بات پر لطیفہ کہتا تھا۔ گویا رما سے برسوں کی ملاقات ہے رما کو بھی اپنے متعلق ایک فرضی قصہ کہنا پڑا۔

دیبی دین۔ تو یہ کہو تم بھی گھر سے بھاگ کر آئے ہو سمجھ گیا گھر میں جھگڑا ہوا ہوگا بہو کہتی ہوگی میرے پاس گہنے نہیں ہیں، میرے نصیب جل گئے، ساس بہو میں ٹھنی رہتی ہوگی، تم نہ ادھر سے بول سکتے ہوگے نہ ادھر سے، جب نہ برداشت ہوئی بھاگ کھڑے ہوئے۔

رما۔ ہاں بابا۔ بالکل یہی کیفیت ہے۔ مگر تم نے کیسے تاڑا؟

دیبی دین ہنس کر بولا۔ یہ بھی ایک علم ہے بھائی۔ بڑی محنت سے آتا ہے ابھی لڑکے بالے تو نہ ہوں گے۔

رما۔ نہیں ابھی تو نہیں ہیں۔

دیبی۔ چھوٹے بھائی ہوں گے۔

رما۔ حیرت میں آکر بولا۔ ہاں دادا ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے کیسے جانا۔

دیبی دین پھر قہقہہ مار کر بولا۔ یہ سب منتروں کا کھیل ہے سسرال مالدار ہے۔

کیوں؟